اُردو شاعری اور منظوم سفر نامہ

[1] محمد عمران شاہد

Abstract

Travelogue is considered as the part of prose, but it is also presented in poetry. in both aspects of Literature Travelogue varies its taste. So poetic travelogue is used often to change the readers interest and aesthetics. This article is based upon the history of the poetic travelogue of Urdu Literature.

کلیدی الفاظ: **اردو شاعری، مثنوی، مرثیہ، منظوم سفر نامہ، مخطوطہ**

اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت ایسی بنائی ہے کہ اُس کے اندر ایسا مادہ رکھا ہے جو اس کو میٹھے بول کہنے اور سننے پر ابھارتا رہتا ہے اس لیے شاعری سے انسان کیف و سرور حاصل کرتا ہے انسان جتنا بھی اداس ہو سازِ ترنم سے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ شاعر پر اُترنے والے الفاظ انسانوں کی سماعت کے لیے دل کش گیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعری ایک فطری جذبہ ہے جو انسان کی سرشت میں قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ شاعری کا آغاز بھی بنی آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوا ہو گا۔ چوں کہ ہر دور میں شاعری کے آثار ملتے ہیں۔ شاعری خوشی، غم، کیف و مستی اور فطری خوب صورتی کے مناظر یوں کھینچتی ہے کہ ہر لفظ قلب و روح کو چھونے لگتا ہے۔ ادب میں غالباً شاعری سب سے پہلا ذریعہ اظہار ہے۔ انسان نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و تجربات کو منظوم شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا تو منظوم داستانیں وجود میں آئیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ واقعات سفر کی حالت میں پیش آئے ہیں اور آتے ہوں گے۔ جن کو لازمی طور پر منظوم صورت میں پیش کیا جاتا ہو گا سفر کی یہ کیفیات منظوم داستانوں میں

---

[1] لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، لودھراں

اب بھی ملتیں ہیں۔

منظوم سفر نامہ لکھنا ایک مشکل فن ہے سفر نامہ کا شمار بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے، اس کا مواد باہر کے ماحول سے لیا جاتا ہے سفر کے تجربات ومشاہدات کی جزئیات کو اس طرح تفصیل سے بیان کرنا سفر نامے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ضرورت نظم کی نسبت نثر میں باآسانی پوری کی جاسکتی ہے اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کچھ فنی پابندی کی وجہ سے منظوم سفر نامہ نہیں لکھا جاسکتا ہے گویا تاریخی حقیقت، جغرافیائی حالات، مشاہدات وتجربات کو منظوم انداز میں بیان کرنا مشکل تو ہے، نا ممکن نہیں۔ شعر میں قافیہ، ردیف، بحور کا استعمال، علامتیں، استعاروں کا برتاؤ، تراکیب کے استعمال کے ساتھ خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز رکھنا مشکل کام ہے۔ یہ کام اُس وقت اور بھی دقیق ہو جاتا ہے جب منظوم صورت میں سفر کی جزئیات کو پیش کرنا ہو۔

منظوم سفر نامے کی جھلکیاں اُردو شاعری میں اکثر شعراء کے ہاں ملتی ہیں۔ نثر میں جو داستانیں اور لوگ قصے لکھے گئے اُن میں مختلف ممالک اور علاقوں کا ذکر کہیں تخیلاتی تو کہیں حقیقت کے قریب تر ملتا ہے۔ اُن میں سفر کا ایک وسیع حصہ شامل ہے۔ عین ممکن ہے یہ داستانیں اور لوگ قصے پہلے منظوم ہوں بعد میں اِن کو نثر میں ڈھالا گیا ہو۔ لیکن جو بھی ہے اس کے بعد جو منظوم داستانیں (مثنویاں) لکھی گئی ہیں۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں منظوم سفر نامے کے عناصر در آئے ہیں علاوہ ازیں بعض مثنویاں بھی ایسی ہیں جن کو پڑھ کر ایک بار احساس ہوتا ہے کہ شاید منظوم سفر نامہ ہے لیکن اِن کے پیچھے ایک غیر شعوری کوشش تھی جس کی وجہ سے اُن کو باقاعدہ منظوم سفر نامہ نہیں کہہ سکتے البتہ اِن مثنویوں نے آنے والوں کو منظوم سفر نامہ جیسی صنف کی طرف میں متوجہ کیا اور اس میں باقاعدہ طبع آزمائی ہونے لگی۔

اس سلسلے میں بہت مثنویوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جن میں میر حسن کا ایک اہم نام ہے میر حسن کا دور ۱۷۲۷ء سے ۱۷۸۶ء تک کا ہے اِن کی مثنویاں ادب میں شہکار نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں اُن کی مثنوی ''سحر البیان'' کے بغیر اردو ادب کی تاریخ ادھوری رہتی ہے۔ اُن کی اس مثنوی میں کہیں کہیں سفر نامے کا گمان ہونے لگتا ہے کیوں کہ سفر نامے میں کسی بھی معاشرے کی رسومات، تہذیب وتمدن اور ثقافت کو پیش کیا جاتا ہے۔ ''سحر البیان'' میں ایک شادی کی تیاری اور اس کے جو لوازمات اور جس طرح سفر ہوتا ہے اس کو بیان کرتے ہیں تو اس علاقہ کی ثقافتی وتمدنی زندگی کی جھلک یوں سامنے آتی ہے۔ مثنوی کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

وہ اسباب شادی کا تیار ہو — مکرر نہ پھر جس کی تکرار ہو
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار — بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار — پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار — وہ موتی کا سہرا، جواہر کا ہار
ٹھہر کر وہ گھوڑے کا چلنا سنبھل — ہلا کے وَے دونوں طرف مور چھل (۱)

میر حسن کی اس مثنوی میں اور بھی بہت سی جگہوں پر سفر نامے کے عناصر ملتے ہیں جس سے آنے والے نئے لوگوں کو ایک راستہ ملا اور اس طرف توجہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی مثنوی ''گلزار ارم'' میں بھی جا بہ جا منظوم سفر نامے کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی دور میں دیا شنکر نسیم نے بھی ایک مثنوی گلزارِ نسیم کے عنوان سے لکھی جس میں اختصار کو بہت مدِ نظر رکھا گیا ہے اِن کے ہاں زبان استعارتی استعمال ہوئی ہے۔ زبان کی صفائی کے ساتھ ساتھ اِس میں واقعات کی ترتیب اور کڑیاں یوں جڑی ہوئی ہیں کہ اگر درمیان میں سے ایک کڑی نکال دی جائے تو پوری کہانی کا تاثر ٹوٹ جاتا ہے۔ تاہم اُن کی مثنوی کے اشعار میں بھی اولین منظوم سفر نامے کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس مثنوی کا وہ حصہ دیکھیے جس میں سفر نامے کا آہنگ ملتا ہے۔ دیا شنکر نسیم اس مثنوی میں ایک شہر کا حال بیان کرتے ہیں جس کی تاریخ کے ساتھ وہاں کی عمارتوں، شہروں اور وہاں کی تمدنی و ثقافتی زندگی کو مصورانہ انداز میں دیکھئے ہیں اور شعروں کی شکل میں یوں ڈھال دیتے ہیں:

اِندراسن امر نگر ہے شہر ایک — خلقت ہے وہاں کی زندہ دل، نیک
اِندر، ہے بادشاہ اس کا — آسن، ہے تخت گاہ اس کا
مصوّں وہ قضا سے اس قدر ہے — اُس بستی کا نام امر نگر ہے
یزدانیوں کا ہے مسکن اس میں — روحانیوں کا ہے نشیمن اس میں (۲)

جب اُردو شاعری کی روایت کا ذکر ہوتا ہے خاص کر غزل کے حوالے سے جس شاعر کا نام ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ خدائے سخن میر تقی میر (۱۷۲۲ء تا ۱۸۱۰ء) ہیں۔ جنھوں نے اُردو شاعری کو وہ دوام بخشا کہ اُن کے بعد آنے والے ہر شاعر نے اُن کی نا صرف تقلید کی بلکہ اُن کو استاد بھی مانا۔ آج بھی میر کی شاعری کی حیثیت مسّلمہ ہے۔ اُن کی شاعری میں بھی منظوم سفر نامہ کے عناصر کے جھلک ملتی ہے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ

کسی مقام کی طرف کوچ کیا جارہا ہے۔ وہ منظر اتنا دل سوز ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ میر تقی میر نہ چاہتے ہوئے یہاں سے سفر کے لیے نکل رہے ہیں۔ کسی جگہ سے کوچ کرنا یا کسی جگہ جانا تمام باتوں کا بیان سفر نامے کا حصہ ہوتا ہے۔ میر تقی میر بھی جب اپنی جنم بھومی اکبر آباد کو خیر باد کہہ رہے تھے اور جو اُن کی دلی کیفیت اور سفر کی مشکلات تھیں اُن یوں منظوم کرتے ہیں:

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دلِ مضطرب اشک حسرت ہوا — جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا (۳)

ایک ایسے شاعر جسے اُن کی زندگی میں تو وہ حیثیت نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے گو بعد میں وہ عوامی شاعر کا لقب پا گئے میری مراد نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵ء تا ۱۸۳۰ء) ہے انھوں نے بھی سفر نامے کی منظوم روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے اُن کی ایک مثنوی جس کا نام ہی ''مثنوی سیر دریا'' ہے جس میں سفر نامے کی وہ ساری خوبیاں موجود ہے جس کی بنا پر اُسے منظوم سفر نامے کی صف میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ دریا کی سیر کرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اُس کو بہت خوب صورتی سے منظوم انداز میں بیان کرتے ہیں اس کی ابتدا تمہید سے ہے پھر کشتی کی توصیف کرتے ہیں اس کے بعد دریا کی صفت بیان کرتے ہیں اس کو اشعار میں یوں باندھتے ہیں:

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — آ گئی دریاے خاطر میں یہ لہر
یعنی ٹک دریا کی جانب جایئے — دو گھڑی واں دل کو خوش کر آیئے
ہر طرف سے دل کے ہو کر دو بدو — جوش میں آیا محیط آرزو
کھینچ کر لنگر ہوس نے ناگہاں — زو رقِ خاطر پہ باندھا بادباں
جی نے یہ چاہا کہ پہلے یک قلم — وصف اُس صحرا کا کر لیجیے رقم
پر جو اوّل بحر کا تھا ماجرا — پہلے اُس میں ہی سخن تیرا مرا
کیا کہوں، دریا تھا یا عینِ نور — جس کی اک اک موج تھی بحر سرور (۴)

اس کے بعد وہ پانی کی خصوصیات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کی مٹھاس کیسی ہے۔ دریا میں موج کیا حیثیت رکھتی ہے کس طرح آتی ہے۔ دریا میں گرداب کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ پھر ماہی کی صفت کے ساتھ ساتھ صدف و ریگ، ساحل، ذرہ ریگ کی بھی توصیف کرتے ہیں آخر دریا کی سیر کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اِن سب کے متعلق اشعار ملاحظہ کیجیے:

قند ہی چپکا نہ تھا کچھ ہو کے مات — منہ سے مصری کے بھی نکلے تھی یہ بات
شربت اس پانی کے آگے روتا تھا — دودھ بھی پانی سے پتلا ہوتا تھا
سردی اور شیرینی اُس میں یوں بھلی — جیسے ہو وہ برف شیریں کی ڈلی
اولے اُس کو دیکھ کر غش کھاتے تھے — ہونٹ شکّر کے بھی چپکے جاتے تھے
گردش گرداب تھی اس طور کی — میں نے جب خوبی پہ اُس کی غور کی
اب پڑوں کب تک میں اُس کے آب میں — کشتیِ دل جا پڑی گرداب میں
آوے کب لطف اُن کا آگاہی تلک — جن کا غل تھا ماہ سے ماہی تلک
ہر صدف بلور سے شفاف تھی — ریگ بھی آب گہر سے صاف تھی
طبع میں عشرت پناہی آ گئی — غم کی کشتی پر تباہی آگئی
یاں اب لیتا ہوں میں صحرا کی راہ — ہیں عجب کچھ واں بہاریں واہ واہ **(۵)**

اردو ادب میں ایک بڑا نام مرزا اسد اللہ غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) کا ہے اِنھوں نے اپنی زندگی میں کئی سفر اختیار کیے۔ اُن میں سے ایک طویل سفر کلکتہ کا ہے جو اُن کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب اُن کی پنشن روک لی گئی اور جائیداد بھی ضبط کر لی گئی تو اس کی بحالی کے لیے انگریز سرکار کے سامنے دُرخواست پیش کرنے کی خاطر دہلی سے کلکتے تک کا سفر کرتے ہیں یہ سفر ایسا تھا اس کا اثر اُن کی شاعری میں بھی در آیا۔ گویا غالبؔ کی شاعری میں بھی منظوم سفر نامے کے عناصر ملتے ہیں۔ اُن کا سفر دہلی سے شروع ہوتا پہلے لکھنو جاتے ہیں لکھنؤ کے سفر کے احوال کو یوں منظوم کرتے ہیں:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو **(۶)**

اس کے بعد بنارس جاتے ہیں وہاں کچھ عرصہ قیام کرتے ہیں۔اُس شہر کی تہذیب و ثقافت کو دیکھتے ہیں بنارس کی خوب صورتیاں غالبؔ کو بھا جاتی ہیں اس شہر اور سفر کے حوالے سے فارسی میں ایک مثنوی ''چراغِ دَیر'' لکھتے ہیں جو اُن کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔اس کے بعد الٰہ آباد سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچ جاتے ہیں یہاں اُن کا قیام نسبتاً طویل ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں اُن کے اخلاق اور رہن سہن سے متاثر ہوتے ہیں۔ خواہش کرتے ہیں اگر میں دہلی میں بیوی بچے چھوڑ کر نہ آیا ہوتا تو یہیں کا ہی ہو کر رہ جاتا کلکتے کو وہ جنت کا ایک ٹکڑا قرار دیتے ہیں۔ کسی جگہ کی جغرافیائی، معاشرتی اور تہذیبی حیثیت بیان کرنا سفر نامے کے زمرے میں آتا ہے۔ غالبؔ کلکتہ کی شان و شوکت کے بارے ایک قصیدہ کہتے ہیں۔ گویا یہ منظوم سفر نامہ کی جانب ایک پیش قدمی ہے۔ مذکورہ قصیدے میں غالبؔ کلکتہ کے لوگوں کے میل ملاپ اور اُن کی طرزِ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں نیز وہاں کے پھلوں کی مٹھاس کی تعریف کرتے ہیں:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے (۷)

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''اردو ادب میں سفر نامہ'' میں بھی کچھ منظوم سفر ناموں کا ذکر کیا ہے۔اُن منظوم سفر ناموں میں کچھ مثنویاں ہیں جن کو انھوں نے سفر نامے کے طور پر پیش کیا ہے۔ گو اِن مثنویوں میں منظوم سفر نامے کے اجزاء موجود ہیں مگر اُن کو باقاعدہ سفر نامہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اِن کے پیچھے سفر نامہ لکھنے کی شعوری کوشش موجود نہ تھی۔اِن میں کچھ مثنویاں ایسی بھی تھیں جو وقت کی گرد تلے دب گئیں اُن کی طرف کسی نے توجہ نہ دی اور ایک بار اپنا وجود کھو کر نایاب ہو گئی تھیں۔اُن میں پہلی مثنوی واجد علی شاہ کی ''حزنِ اختر'' ہے اس کی حیثیت ایک آپ بیتی کی ہے۔ جس میں واجد علی شاہ نے اپنے معزول ہونے کے بعد کی تمام مشکلات کو تفصیل اور جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس مثنوی میں ایک حصہ ہے جس میں انھوں نے اپنے اس سفر کا حال بھی بیان کیا ہے جو اُن کو لکھنؤ سے معزولی کے بعد کلکتہ تک سفر اختیار کرنا پڑا اور وہاں پر قید و بند کی جو صعوبتیں سہنا پڑیں۔ اور سفر میں جو

مشکلات پیش آئیں اُن کو موضوعِ سخن بنایا۔ اس بارے میں ڈاکٹر توصیف تبسم لکھتے ہیں :

''واجد علی شاہ کی معزولی اگرچہ ۱۸۵۶ء کے اوائل میں ہوئی لیکن چوں کہ اِن کی مثنوی ''حزنِ اختر'' اُن ایام میں لکھی گئی جب ۱۸۵۷ء کی شورش کے نتیجہ وہ نظر بندی کی حالت میں بسر کر رہے تھے۔''(۸)

یہ مثنوی ۱۱۲ صفحات اور ۱۲۳۸ منظوم اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کی چھوٹی بحر نے اس قدر روانی اور تحرک پیدا کیا ہے کہ کہیں بھی قوافی اور اوزان کی پابندی رکاوٹ بنتی محسوس نہیں ہوتی یہ شاعر کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتی ہے۔ مثنوی کے ابتداء یعنی حمد، نعت اور منقبت کے بعد لکھنؤ سے جس طرح رخصتی ہوتی ہے اور پھر لکھنؤ کو روانہ ہوتے ہیں۔اِن سب باتوں کو دل سوز انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

رزیڈیٹ جرنیل اوٹرم جو تھے — گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
یہ بندہ بہت اِن دنوں تھا علیل — کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل
رجب کی غرض پانچویں جب کہ آئی — اسی سن میں راہی ہوئے جان مائی
لیا ساتھ ماں کو اور اک بھائی کو — نہ کچھ کام فرمایا خود رائی کو
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر — لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ما حضر
رجب بھر رہے کان پور میں مقیم — برنڈن کے بنگلے میں با خوف و بیم
الٹا جو آباد ہے ایک نام — رہے آٹھ دن اس میں اے خوش خرام
بنارس میں آ کر رہے چودہ روز — وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز (۹)

بنارس میں چودہ دن ٹھہرنے کے بعد واجد علی شاہ کلکتہ کے لیے دخانی قسم کے جہاز پر روانہ ہوئے۔ وہ کلکتہ سے مذن ملکہ کے سامنے عرضداشت پیش کرنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔ لیکن کلکتہ پہنچ کر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد ایک جشن برپا کرتے ہیں جو تین دن تک جاری رہتا ہے۔اس سارے سفر کا حال یوں منظوم کرتے ہیں:

وہاں پر دخانی کیا اک جہاز — چڑھے اس پر جس دم ہوئے سر فراز
رہے اس پہ ہم بیس اُنیس دن — وہ جاشو تھے اس پر کہ جس طرح جن
دکھائی دیا جب کہ ماہِ صیام — تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام
مرے آدمی سب اکٹھے ہوئے — محل میں جو تھے سب وہ یکجا ہوئے

ہوا ہر طرف ناچ گانا شروع　　درختِ خوشی کی جمی سب فروع
تو سو سو رہے جا کے سب گل بدن　　گیا خواب میں وہ چمن کا چمن (۱۰)

واجد علی شاہ کی اس مثنوی میں جو سفر کی داستان ہے گو وہ انتہائی درد والم، حسرت و بے بسی کی عکاس ہے لیکن اس میں مشاہدے اور تاثرات کی گہری چھاپ موجود ہے۔ بہت خوب صورتی کے ساتھ سفر کے تجربات کو اشعار کی شکل میں ڈھالا گیا ہے۔ لہذا یہ مثنوی منظوم سفر نامے کی بنیاد قرار دی جاسکتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مثنوی نایاب ہوگئی تھی۔اس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''یہ منظوم خودنوشت سب سے پہلے ۱۲۷۶ھ میں شائع ہوئی تھی اور نایاب ہو گئی تھی لیکن عبدالحلیم شرر نے۔۔۔۔اسے اپنے مقدمے کے ساتھ دائرہ ادبیہ لکھنو کی جانب سے ۱۹۲۲ء میں چھپوا کر ممکن الحصول بنادیا۔''(۱۱)

قلق لکھنوی نے بھی ایک رودادِ سفر ''سفر آشوب'' کے نام سے لکھی۔ قلق لکھنوی واجد علی شاہ کے درباری شاعر تھے۔ جب واجد علی شاہ کو سقوطِ لکھنؤ کے بعد شہر بدر ہو کر کلکتہ جانا پڑا تو قلق بھی ساتھ گئے۔ اِن کو بھی کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ جب قلق لکھنوی رہائی کے بعد واپس لکھنؤ آئے تو لوگوں نے اُن سے واجد علی شاہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے جواب میں قلق لکھنوی نے منظوم انداز میں جو روداد سنائی اُس کو ''سفر آشوب'' کا نام دیا۔اس میں زیادہ تر لکھنؤ میں گزرے ہوئے اُن حسین دنوں کا تذکرہ ہے جب ہر طرف عیش و عشرت تھی اور اس کا کچھ حصہ سفر کے حوالے سے ہے۔ جو شاہِ اودھ کی معزولی کے بعد اُن کے ساتھ کلکتہ جاتے ہوے صعوبتوں اور مصیبتوں میں طے ہوا۔ ''سفر آشوب'' ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی اور قلق لکھنوی کی زندگی میں ہی ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اُس دور کی مقبول ترین ہیئت مسدس میں لکھی گئی جو مرثیہ کے لیے خاص طور پر مستعمل تھی۔ یہ سفر آشوب ۱۲۴ مسدس بندوں پر مشتمل ہے سفر کا بیان ۵۰ بند میں کیا گیا ہے۔ سفر کا حال کچھ اس سے شروع ہوتا ہے:

دے کے کچھ اپنا تصدق اُسے سوار ہوئے　　کوس بھر شہر سے دریا ہے جو ہم پار ہوئے
پھنس گئی ریتی میں بگھی تو یہ ناچار ہوئے　　مستعد کھینچنے پر لوگ اُسے ہر بار ہوئے
ریت پر برہنہ پا خود بھی اُتر کر کھینچا　　الغرض دُور تلک سب کے برابر کھینچا
جب چلے واں سے تو دریا کا سفر ٹھہرایا　　اک جہاز ایسا پرانا سا دخانی پایا

جس سے کشتی فلکِ کہنگی میں ہم پایا　　باد و باراں نے بھی اُس دن کرم فرمایا
جب ہوا زوروں کی چلتی تھی تو گھبراتے تھے　　کثرت بارش ہر روزہ سے ہول آتے تھے
ہوگیا موج کے صدموں میں گرفتار جہاز　　دفعتاً چلنے لگا مست کی رفتار جہاز
سوچ تھی ہوگا یہ کس طرح سے اب پار جہاز　　بچ گیا ڈوبنے سے اس میں گئی بارجہاز
مارے دہشت کے نہ تھادید کایاراس دم　　نظر آتا تھا کسی جانہ کنارا اس دم **(۱۲)**

''سفر آشوب'' میں قلق لکھنوی نے سہل اور شیریں زبان استعمال کی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ روانی اور تسلسل کو بھی قائم رکھا ہے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج کے دور کی شاعری ہو۔ اسی قادر الکلامی کی وجہ سے وہ ناظمِ شیریں کہلاتے تھے۔ اُن کا شمار لکھنو کے نام ور شعراء میں ہوتا تھا۔ سلسلہ نسب امام بخش ناسخؔ سے ملتا تھا۔ سفر آشوب میں منظوم سفر نامے کے اجزا بکثرت ملتے ہیں تاہم اس کو باقاعدہ سفر نامہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اس سب کے باوجود ''سفر آشوب'' کو ایک کامیاب سفر نامہ قرار دینا ممکن نہیں۔'' **(۱۳)**

منظوم سفر نامے کی روایت میں ایک اہم نام میر محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی کا ہے جو لکھنؤ میں آکر امام بخش ناسخؔ کے شاگرد ہوئے جب ناسخؔ نے لکھنو چھوڑا تو اِسے رشکؔ کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ منیر شکوہ آبادی قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں باندہ کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف صف بستہ تھے، شکست ہوئی گرفتار ہوگئے اور نو ماہ تک باندہ میں قید رہے پھر الہ آباد لے جایا جاتا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق انھوں نے جنگِ آزادی کے بعد ایک طوائف نواب جان کو قتل کیا تھا اسی جرم کی سزا کے طور پر کالے پانی بھیجا گیا تھا۔ منیرِ شکوہ آبادی نے یہ روداد ایک طویل نظم کی صورت لکھی اس کو اُن کی خود نوشت بھی کہا جاسکتا ہے اور منظوم سفر نامہ بھی، فرخ آباد چھوڑنے، باندہ میں قید ہونے اور کالے پانی کو جاتے ہوئے سفر میں جو صعوبتیں برداشت کیں اُن کا ذکر بھی منظوم انداز میں کرتے ہیں۔ منیرؔ شکوہ آبادی نے چھے سال (جولائی ۱۸۶۰ء تا جولائی ۱۸۶۵ء) کالے پانی میں جلاوطنی اور قید میں گزارے۔ اس دوران میں بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کیا اس کے بعد رہائی ملی اور وطن واپسی ہوئی سفر ہذا کی کیفیات کو اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیرؔ　　فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہے

اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں　　اے ہندوستان کا اب سفر مسعود ہے
آ کے بیٹھا ہوں جہاز تیز رو پر شکر ہے　　لنگر اُٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہے
آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی　　دو شنبہ، نیمۂ ماہِ صفر مسعود ہے (۱۴)

منیر شکوہ آبادی نے یہ تمام حالِ سفر تاریخی قطعات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ ان کی اپنی آپ بیتی ہے وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر قید ہونے تک اور اُس کے بعد رہائی ملنے کے بعد تک کے واقعات کو مختلف ادوار میں سنین کے حساب سے منظوم کرتے رہے اس کی شاعری میں منظوم سفر نامے کے عناصر جھلک نمایاں ہے دوران قید اور واپسی کے سفر میں مشکلات بھی برداشت کیں مگر شاعری کو نہیں چھوڑا۔ اِس حوالے سے اُن کے یہ اشعار دیکھیے:

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں　　نرنگ گردشِ فلکِ نیلہ رنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس　　شکرِ خدا کا رہا ہوئے کامِ نہنگ سے
ہندوستان میں آ کے رہے ہم پراگ میں　　اب کان پور جاتے ہیں دل کی اُمنگ سے
کرتے ہیں صید آ ہوئے مضمون کو راہ میں　　اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے (۱۵)

آپ بیتی کے جو قطعات سامنے آئے ہیں اس میں وہ شاعری زیادہ نظر آتی ہے جو دورانِ سفر کی گئی جب شاعر سفر کی حالت میں ہو تو غیر شعوری طور پر سفر کی خصوصیات اُس میں در آتیں ہیں۔ جب اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو منیر شکوہ آبادی کی شاعری میں بھی منظوم سفر نامے کا ایک بڑا حصہ نظر آتا ہے لیکن یہ منظوم سفر نامے کے لیے کوئی شعوری کاوش نہیں تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ منیر شکوہ آبادی نے منظوم سفر نامہ نہیں لکھا لیکن اِن قطعاتِ تاریخ میں سفر کا حال، اُن کے تاثرات، اور گرد و پیش کا احوال اس طرح سما گیا ہے کہ اُسے سفر نامے کے طور پر قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔''(۱۶)

سر کشن پرشاد نے بھی پنجاب کی سیر کی اور اس کے بعد اپنے تاثرات کو ''سیرِ پنجاب'' کے عنوان سے منظوم کیا۔ جو منظوم سفر نامہ لکھنے والوں کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیرِ پنجاب ایک مثنوی ہے جس میں جذبات کی شدّت پائی جاتی ہے اس لیے تاثر سفر نظم کرنے کی کوشش میں وہ بات کھل کے سامنے نہیں آتی بلکہ ایک ادھورے پن کا احساس رہتا ہے۔ البتہ ایک اچھی کاوش تھی۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں جس

میں بمبئی کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی شان و شوکت بیان کرتے ہیں:

بمبئی کیا تری اعلیٰ ہے شان — شاہِ آصف ہوئے تیرے مہمان
تجھ میں کیا شان دل آرائی ہے — حسن ہے، آن ہے، رعنائی ہے
راستے تیرے بڑے اور وسیع — ہیں مکان اونچے، بلند اور رفیع
ہندوؤں کے ہیں دھرم شالے بھی — مسجدیں بھی ہیں خدا والے بھی
تار برقی کا نرالا ہے کام — ہے ٹیلی فون سے سب کو آرام
جمگھٹا روز پری ردیوں کا — ہوتا ہے خلد کا اکثر دھوکا (۱۷)

غالبؔ کے بعد اردو ادب میں ایک اور بڑا نام مرزا داغ دہلوی (۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء) کا تھا، جو شاعری میں معاملہ بندی، روز مرہ زبان اور محاوروں کے استعمال میں اپنی مثال آپ تھے۔ اُن کے اشعار میں اتنی بے ساختگی اور روانی تھی کہ لوگوں کو بہت جلد زبانی یاد ہو جاتے تھے اس لیے بہت چھوٹی عمر میں ہندوستان میں مشہور ہو گئے اور اُن کا شمار اُستاد شعروں میں ہونے لگا۔ اِن کے بغیر بھی اردو ادب کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے بھی اپنے ایک سفر کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے جو اُنھوں نے رام پور سے کلکتہ تک کیا۔ یہ سفر اُنھوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا، وہ یوں کہ اُن کو کلکتہ کی ایک ڈیرہ دارنی عورت منی بائی حجاب سے رام پور کے میلے ''بے نظیر'' میں محبت ہو گئی۔ حجاب بائی کو ملنے جاتے ہیں واپس آ کر وارداتِ عشق کو ایک مثنوی ''فریادِ داغ'' میں تحریر کرتے ہیں جو اُن کا ایک الگ سے دیوان ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں وہ اس سارے سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔ داغؔ نے رام پور سے کلکتہ تک کا جو سفر کیا درمیان میں وہ کئی شہروں سے ہو کر گزرے۔ اس سفر کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کلیاتِ داغؔ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''وہ (داغؔ) رامپور سے پہلے دہلی گئے لیکن اپنے اس شہر میں جی نہ لگا۔ پھر کانپور اور الٰہ آباد میں چند دن ٹھہرے وہاں سے عظیم آباد (پٹنہ) گئے جہاں لوگوں نے بہت پذیرائی کی۔ آٹھ روز وہاں قیام رہا۔ شدید گرمی تھی اس لیے بذریعہ ریل کلکتہ روانہ ہوئے۔ کلکتہ اُنھیں بہت پسند آیا۔ حجاب سے خوب ملاقاتیں رہیں۔۔۔۔ کلکتے سے رخصت ہوئے اور سیدھے ریل سے دہلی پہنچے اور وہاں سے اُسی روز رامپور پہنچ گئے۔'' (۱۸)

جس طرح رام پور سے دہلی گئے پھر لکھنؤ پہنچے وہاں کے حالات دیکھے۔ پھر کانپور سے چل کر الٰہ آباد

آ گئے وہاں سے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے جو کچھ راستے میں اور وہاں پہنچ کر دیکھا اس کو داغؔ نے اپنے الفاظ میں یوں منظوم کیا ہے :

مل گئی جب حضور سے رخصت — میں ہوا رام پور سے رخصت
چل کے دہلی سے لکھنؤ پہنچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا
بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے — مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے
راہ میں کان پور، الہ آباد — میں نے دیکھے مگر نہ حسبِ مراد
اتنے میں آ گیا عظیم آباد — تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد
آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی — یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی
کیا قیامت تھی شہر کی گرمی — کاش کنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آب میں گرمی — مثل اخگر حباب میں گرمی (۱۹)

عظیم آباد (پٹنہ) میں بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے وہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ کلکتہ جانے سے پہلے اُن کی خواہش تھی کہ یہاں بارش ہو تو پھر کلکتہ کے لیے رَختِ سفر باندھیں۔ مرزا داغؔ عظیم آباد میں آٹھ دن گزارنے کے بعد کلکتہ روانہ ہو جاتے ہیں وہاں کی خوب صورتی کو دیکھتے ہیں تو غالبؔ کی طرح اِن کو بھی کلکتہ پسند آتا ہے۔ وہاں کے رہن سہن، لوگوں کے میل ملاپ اور وہاں کی عیش و عشرت کو یوں منظوم کرتے ہیں:

سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا — دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوقِ بے اختیار لے ہی گیا — یہ دل بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا — داغ آیا تو باغ باغ آیا
دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں — ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں
سر بازار وہ مکانِ بلند — جس کو کہیے اک آسمانِ بلند
چرخ کو رتبہ اس مکاں سے کہاں — دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں
شرم و غیرت سے چھپ گئی جنت — ورنہ یہ قصر دیکھتی جنت
ہم جو بالائے بام رہتے تھے — لوگ عالی مقام کہتے تھے
سامنے ناخدا کی مسجد تھی — ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی

مظہرِ نور ہے یہی مسجد　　بیتِ معمور ہے یہی مسجد
اس کا جلوہ سرور آنکھوں کا　　اس کا دیدار نور آنکھوں کا
صبح سے شام تک جمال کے لطف　　شام سے صبح تک وصال کے لطف **(۲۰)**

اس طرح داغ کی شاعری میں بھی منظوم سفر نامے کے عناصر ملتے ہیں وہ اپنی غزلوں میں بھی کہیں کہیں کسی سفر یا شہروں کا ذکر کرتے ہیں خاص کر کلکتہ کا جو اُن کے دوسرے دواوین میں بھی موجود ہے یہ جب دہلی سے کلکتے پہنچتے ہیں تو اس سفر کو ایک غزل کے مقطعے میں یوں بیان کرتے ہیں:

؎　دلی سے تو کلکتے میں پہنچے، مگر اے داغ
کیوں کر ہوں حصارِ فلک پیر سے باہر **(۲۱)**

منظوم سفر نامے کی روایت میں مولانا سید سلمان ندوی کا حصہ بھی ہے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں تبلیغی سر گرمیوں کے حوالے سے گجرات (ہندوستان) کا سفر کیا تھا وہاں کے خطہ کو بغور دیکھا اس خطے کی نمایاں خصوصیات کے متعلق بتاتے ہیں۔ وہاں وہ ایک علاقہ بھڑوچ دیکھتے ہیں جو دریائے نربدا کے کنارے آباد ہے نربدا دریا بحر عرب سے جاملتا ہے۔ عرب اس دریا کو بروص کہتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جنگی جہاز اس کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے تھے۔ جب سید سلمان ندوی اس کی شان و شوکت دیکھتے ہیں اُن کے اندر کا شاعر جاگ اُٹھتا ہے اور اس سارے منظر نامے کو منظوم کر دیتے ہیں کسی جگہ کی سیر کرنا وہاں کی جزئیات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا سفر نامہ شمار ہوتا ہے خواہ یہ منظوم یا منثور، سید صاحب نے مذکورہ منظر کو یوں بیان کیا ہے:

''جب میں بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں، اور گو میں شاعر نہیں تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی۔

نربدا اے نربدا! اے جادہ بحر عرب　　گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادہ بحر عرب
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز　　تیرے دروازہ پر ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
تو گزشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے　　ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتہ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار　　تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ پاتاں — تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں
تو ہے دریائی پری یا شاہد عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سرشار جام — اس تن آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام
اے بھڑوچ! اے خانم انگشت رو نربدا — عہد ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا
تو تیائے چشم ظاہر آج تیری خاک ہے — ذرہ ذرہ پر تو خورشید ذی لولاک ہے
یاد گار عہد خیرالقرن ہے تیری زمیں — مطلع انوار ذی النورین ہے تیری جبیں
چشم عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں — تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں **(۲۲)**

ابوالاثر حفیظ جالندھری جن کا شمار پاکستان کے قومی شاعروں کی صف میں ہوتا ہے۔اِنھوں نے خود تو کوئی منظوم سفر نامہ نہیں لکھاالبتہ ۱۹۳۵ء میں نواب آف ریاست بہاول پور نواب محمد صادق خامس کی معیت میں حج کو جاتے ہیں، توجب جدہ سے مدینہ کی طرف روانگی ہوتی ہے وہاں نعتیہ اشعار کی صورت میں اس سفر کی روانگی کا حال، سالارِ قافلہ کا تعارف کچھ یوں کراتے ہیں:

مدینہ کو چلا ہے قافلہ ایمان والوں کا — رہِ حق میں سر تسلیم خم ہے ایمان والوں کا
خدا چاہے تو دونوں جگ میں بیڑا پار ہے اس کا — کہ سر صادق محمد کارواں سالار ہے اس کا
رسولؐ اللہ کے جلووں سے دل پُر نور ہو تیرا — مرادیں تیری پوری اور حج منظور ہو تیرا **(۲۳)**

یہ اشعار نواب صادق محمد خاں خامس نے اپنے سفر نامے ''حج صادق'' میں تحریر کیے ہیں ان میں منظوم سفر کی ایک ہلکی سی جھلک ملتی ہیں۔

منظوم سفر نامے کی روایت میں علیم ناصری نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے اگرچہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں خود بھی سفر کیے ہوں گئے۔ لیکن اُن کو منظوم نہیں کیا ہے۔ البتہ انھوں نے ''شاہ نامہ بالاکوٹ''جو تحریک جہاد کی منظوم داستان ہے، کو منظوم کیا ہے۔شاہ نامہِ بالاکوٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی ساری زندگی سفر کرتے ہوئے گزری ہے۔انھوں نے جتنے بھی سفر کیے ہیں اُن تمام اسفار کو علیم ناصری نے منظوم انداز اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں منظوم سفر نامے کی تمام جزئیات سموئی ہوئی ملتی ہیں۔سید احمد شہید نے سفر حج اختیار کیا اُس سے واپسی پر یہ سفر عظیم آباد سے بنارس، مرزاپور اور

الٰہ آباد تک دریائی مسافرت کے تجربے پر مشتمل ہے۔ان کے سفر کے اس تجربے کو علیم ناصری نے اشعار میں یوں ڈھالا ہے:

بڑھیں اب کشتیاں آگے عظیم آباد کی جانب — فداکارانِ حق کے شہر خوش بنیاد کی جانب
چلا وہ کارواں کے ساتھ ہی مل کر بریلی کو — کہ وہ سمجھے ہوئے تھا جان و دل سے گھر بریلی کو
عظیم آباد سے آگے بنارس میں رکے جا کر — زیارت کے لیے دوڑے ہوئے آئے مرید اکثر
بنارس سے روانہ ہوکر مرزاپور آ ٹھہرے — الہ آباد کے سنگم سے تھوڑی دور آ ٹھہرے
زیارت کے لیے یاں بھی ہر اک میر و فقیر آیا — محبت سے عوام الناس کا جمِ غفیر آیا
یہاں سے تیسرے دن قافلے نے کوچ فرمایا — اور اپنی کشتیوں کو جا الہ آباد ٹھہرایا
یہاں جمنا کنارے شیخ کے بنگلے پہ آ ٹھہرے — بڑے امن و سکوں کے ساتھ مردانِ خدا ٹھہرے **(۲۴)**

علیم ناصری کی ایک اور کامیاب کاوش ''بدر نامہ'' ہے جس کو شاعر نے مثنوی کا نام دیا ہے جو مسدّس ہیت میں لکھی ہوئی ہے۔ جس میں انھوں نے نبیؐ کی ابتدائی زندگی سے لے کر جنگ بدر کے اختتام تک کے اہم واقعات کو منظوم انداز میں پیش کیا۔اس میں نبیؐ نے جو سفر اختیار کیے وہ بہت خوب صورت انداز بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ منظوم سفر نامہ لکھنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں ہے اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو کسی بھی سفر کے حال کو بہت اچھے طریقے سے منظوم کیا جاسکتا ہے۔ بدر نامہ میں معراج کے سفر کے علاوہ سفرِ طائف اور ہجرت مدینہ کے علاوہ اور سفروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ سفر طائف کے حوالے سے دو بند ملاحظہ ہوں:

سوچا رسولِ پاک نے باہر نکل چلیں — پہنچائیں یہ پیغام کسی اور شہر میں
شاید وہاں ہمارے کوئی ہم نوا ملیں — سن کر پیام حق وہ کوئی غور بھی کریں
مکہ کے بعد بستی تھی طائف قریب تر — اللہ کے رسول نے رُخ کر لیا اُدھر
طائف کے لوگ مکہ سے بڑھ کر تھے بدلگام — بدبخت لات ہی کے پجاری تھے خاص و عام
بھڑکے بہت، سنا جوں ہی اللہ کا کلام — اللہ کے رسول کے دشمن ہوئے تمام
پتھر چلا کے آپ کو مجروح کردیا — نعلین کو لہو سے لعینوں نے بھر دیا **(۲۵)**

اس کے علاوہ بہت سی ایسی مثنویاں بھی ہیں جن میں سفر نامے کے عناصر بکثرت ملتے ہیں لیکن وہ

مثنویاں نایاب ہو گئی ہیں۔ البتہ ہمیں منظوم سفر نامے کے عناصر کی جھلک بیشتر شاعر کے ہاں کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی ہے خواہ وہ مثنوی ہو، مرثیہ ہو یا قصیدہ ہو حتی کہ غزل کے پیرائے میں بھی منظوم سفر نامے کے اجزاء مل جاتے ہیں۔ نیز علاوہ حج ناموں، نعتیہ شاعری میں بھی منظوم سفر نامے کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اگر اردو شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس موضوع پر ایک دقیق مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ میر حسن دہلوی، مثنوی سحر البیان، مرتبہ: رشید حسن خاں (نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۵۹۔

۲۔ دیا شنکر نسیم، گلزارِ نسیم، مرتبہ: رشید حسن خاں (لاہور: مجلس ترقی اُردو، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۱۳۔

۳۔ میر تقی میر، کُلیات میر (جلد ہشتم)، مرتبہ: کلب علی فائق، (لاہور: مجلس ترقی اُردو، س۔ن)، ص ۱۲۱: ۱۲۲۔

۴۔ نظیر اکبر آبادی، کلیاتِ نظیر، مرتبہ: عبدالباری آسیؔ، (لاہور: مکتبہ شعر و ادب سمن آباد، ۱۹۱۵ء)، ص ۳۳۹۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۴۳۔

۶۔ اسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالب، مرتبہ: معین الرحمن سیّد، ڈاکٹر، (لاہور: مکتبہ اعجاز، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۵۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۷۳۔

۸۔ توصیف تبسم، ڈاکٹر، جنگِ آزادی 1857ء کا مجاہد شاعر، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۲۴۔

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س ن)، ص ۶۲۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۲۶۔

۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی منظوم داستانیں، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۱ء)، ص ۲۷۳۔

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۶۲۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۲۸

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۳۳۔

۱۸۔ داغ دہلوی، مرزا، کلیاتِ داغ، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۳۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۴۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴۷۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۹۴۔

۲۲۔ سلمان ندوی، سید، سفر گجرات کی یاد گاریں، مشمولہ، ''الزبیر'' (سفر نامہ نمبر)، (بہاول پور: اردو اکیڈمی، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۶۸۔

۲۳۔ شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر، حجِ صادق۔ایک منفرد حج نامہ، ایضاً، ص ۳۴۸۔

۲۴۔ علیم ناصری، شاہنامہ بالا کوٹ، (لاہور: ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی، اشاعت دوم ۱۹۹۵ء)، ص ۱۱۸: ۱۱۹۔

۲۵۔ علیم ناصری، بدر نامہ، (لاہور: دارالاندلس، اشاعت اول، اکتوبر ۲۰۰۲ء)، ص ۴۰۔